اُردو غزل اور نفسیاتی شعور

سلیم اختر / راحیلہ / محمد الطاف یوسف زئی

ABSTRACT:

According to psychological study poetry belongs to those dreams of poet that he watches in awaking condition. Freud explains poetry as language of dreams. The atmosphere that we find in Urdu ghazal is approximately similar to all those atmospheres (condition) that is present in human's sub –conscious.

Keywords:

Psychological Criticism, Urdu Ghazal, Freud, Subconscious

ادب کی دنیا میں شاعری کی بے شمار تعریفات بیان کی گئی ہیں مگر سب سے زیادہ عام فہم اور بہترین تعریف یہ ہے کہ جو کلام موزوں ہو وہ شعر ہے۔ اس کے علاوہ اصطلاحی سطح پر شعر سے مراد وہ کلام ہے جو انسانی خوشی اور غم کو اُبھارے۔

قدیم دور سے ہی شاعر اور شاعری کے حوالے سے مختلف نظریات پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ ہومر کے ہاں شاعری کے ذریعے لطف تخلیق کرنا اور شاعرانہ قوتوں کا اظہار اہم ہے۔۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تحریر کرتے ہیں:

> "ہومر کے نزدیک شاعری کا مقصد لطف ہے جو ایک قسم کے جادو سے پیدا ہوتا ہے۔ ہومر شاعرانہ قوت کو الہامی قوت کہتا ہے اور اسے دیوتاؤں سے منسوب کرتا ہے۔"[۱]

ارسطو افلاطون کا شاگرد تھا، اس نے اپنے استاد افلاطون کے شاعری کے خلاف اٹھائے گئے تمام اعتراضات کو مربوط اندازِ فکر میں تبدیل کر دیا۔ ارسطو تخلیق کے جذبے کو احساسات و جذبات کے ساتھ منسلک کرتا ہے۔ اس کے مطابق شاعری پہلے جذبات کو ابھارتی ہے اور پھر ان جذبات کا کتھارسس کرتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی تحریر کرتے ہیں:

"جدید نفسیات میں کتھارسس (Catharsis) نے ارتفاع (Sublimation) کی شکل اختیار کرلی ہے جو شاعری کے جذباتی اثر کے سلسلے میں آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔"[٢]

انسانی جذبات کا اظہار شاعری کے ذریعے موثر انداز میں کیا جاتا ہے۔ شعر میں استعمال کیے جانے والے الفاظ جذباتی سطح پر کتھارسس کا ذریعہ بنتے ہیں اور انسانی احساسات و تصورات کے مختلف نقوش کو نمایاں کرتے ہیں۔ لفاظ کی ضرورت تب محسوس ہوئی جب ہم اپنی داخلی اور خارجی کیفیات کو بہتر انداز میں دوسروں تک پہنچانا چاہتے ہوں تو اس مقصد کے لیے ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال کرتے ہیں کہ دوسرا شخص آسانی سے سمجھ سکے ۔شاعری کے ذریعے انسان کی داخلی دنیا میں اٹھنے والے جذبات و احساسات کو ماضی کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔ ورڈزورتھ شاعری اور جذبات کے اظہار کے متعلق بتاتا ہے:

"شاعری قوی جذبات کا ایک اضطراری میلان ہے۔ اس کا سرچشمہ ماضی کے وہ جذبات ہوتے ہیں جنہیں سکون کے لمحوں میں یاد کیا جائے۔"[٣]

گویا ورڈزورتھ کے نزدیک شاعری کا تعلق جذبات کے ساتھ ماضی کے حوالے سے بھی جڑا ہوا ہے کیوں کہ شاعر ان جذبات پر بھی غور کرتا ہے جو ردعمل کی صورت میں غائب ہو کر مماثل نئے جذبات کو پیدا کرتے ہیں اور شاعر کے نفسی عوامل کو سامنے لاتے ہیں۔ علم نفسیات میں ان عوامل کا تعلق ناسٹالجیا کے ساتھ ہے۔ کیوں کہ ناسٹالجیائی روش ماضی پرستی ہے۔ اردو غزل کا بڑا ذخیرہ جہاں رومانویت کے زیر اثر ہے وہیں رومانویت اپنے دل کو رمق ماضی پرستی سے فراہم کرتی ہے۔

نفسیاتی لحاظ سے شاعری کے مطالعے سے یہ نکتہ سامنے آتا ہے کہ شاعر اور نیوراتی مریضوں میں چند مشابہتیں ہوتی ہیں اور ان دونوں کا لاشعور سے تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔ خاص طور پر دونوں فینٹسی (Fantasy) پر انحصار کرتے ہیں__ حالانکہ دونوں کی تخیلاتی دنیا میں بہت حد تک فرق ہوتا ہے۔ علم نفسیات کے مطابق شاعری کا تعلق شاعر کے ان خوابوں سے ہے جنہیں وہ (Day-Dreaming) بیداری کی حالت میں دیکھتا ہے۔ اس لیے فرائڈ نے شاعری کو خوابوں کی زبان کہا ہے۔ اس حوالے سے محمد نعیم بزمی رقم طراز ہیں:

"فرائڈ کے مطابق شاعر Day Dreamer ہوتا ہے جو اپنی تشنہ آرزوؤں کو عالم خواب کے بجائے عالم بیداری میں دیکھتا ہے۔۔۔۔۔ فرائڈ کی نظر میں شاعری خوابوں کی زبان اور نفس لاشعور کی پیداوار ہے۔"[٤]

علم نفسیات کی سطح پر شاعر اور بچے کی ذہنی سطح کا آپس میں موازنہ پیش کیا گیا ہے۔ فرائڈ نے ایک کھیلتے ہوئے بچے کی مثال پیش کی ہے کہ جس طرح ایک کھیلتا ہوا بچہ اپنی مرضی کے مطابق ایک الگ دنیا بناتا ہے یا اپنی دنیا میں موجود چیزوں کو نئے سرے سے تشکیل دیتا ہے اسی طرح ایک فنکار بھی اپنی من پسند دنیا تخلیق کرتا ہے اور اسے اپنی سوچ اور منشا کے مطابق سجاتا سنوارتا ہے اور اس خیالی دنیا کو حقیقت کی دنیا سے جداگانہ حیثیت عطا کر کے اپنی دبی ہوئی خواہشات اور جذبات کو اس میں شامل کر دیتا ہے۔ شاعر اپنے تخیل کے زور پر ہمارے سامنے ایسی اشیا کو مجسم حالت میں لا کھڑا کرتا ہے کہ جن اشیا کے متعلق ہم بالکل نہیں جانتے۔ شاعروں کی فینٹسی کے حوالے سے یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی خیالی دنیا کے مطابق ایسا پھول ایجاد کر سکتا ہے کہ جو ابھی دنیا میں پیدا ہی نہیں ہوا۔ ثابت ہوا کہ تخیل (Day Dreaming) ایسی طاقت کا حامل ہے کہ جس کے ذریعے انوکھی چیزیں شاعر پر اس طرح نازل ہو رہی ہوتی ہیں کہ جیسے وحی اتر رہی ہو۔ کولرج تخیل کے بارے میں لکھتا ہے:

> "خیال میری نظر میں یا تو بنیادی ہوتا ہے یا دوسرے درجے پر، بنیادی تخیل کو میں تمام انسانی فہم اور زندہ قوت کا محرک سمجھتا ہوں اور نفسِ محدود میں دائمی تخلیقی عمل کے لا محدود "میں ہوں" کی تکرار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ثانوی تخیل کو میں اس کی صدائے بازگشت سمجھتا ہوں جو شعوری ارادے کے ساتھ ساتھ موجود ہوتا ہے۔"۵

کولرج کے نزدیک تخیل وہ قوت ہے جو محدود نفسی عوامل کو غیر محدود نفسی عوامل سے ہم کنار کرتا ہے اور شعور کی کڑیوں کو لاشعور سے مربوط کرتا ہے۔ غزل اور نفسیاتی عوامل کے حوالے سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ہر صنف دوسری صنف سے جداگانہ حیثیت کی حامل ہے اور ہر صنف کی اپنی تکنیک، الگ انداز بیان اور مختلف مضامین اور خیالات ہوتے ہیں اسی طرح غزل کو دیگر اصناف سے الگ کر کے نفسیاتی سطح پر پرکھا جا سکتا ہے۔ روایت کے سائے میں پروان چڑھنے والی صنف سخن غزل بھی علم نفسیات کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ کیوں کہ لاشعوری محرکات کے اظہار کے لیے غزل بہترین ذریعہ ہے۔ اسی حوالے سے سید شبیہ الحسن کی اس رائے کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے:

> "ہماری تمام ادبی اصناف میں غزل ہی کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ وہ لاشعوری جبلّتوں کو بغیر کسی بڑی تبدیلی کے اپنے اندر سمو سکتی ہے۔ ہمیں غزل میں جو فضا ملتی ہے وہ تقریباً ہر پہلو سے اس فضا سے مشابہت رکھتی ہے جو انسانی لاشعور میں موجود ہے۔"۶

فراق گورکھپوری، اختر اورینوی، سید شبیہ الحسن اور سلیم احمد نے اپنی تحریروں میں غزل کی نفسیاتی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے خیال میں غزل میں داخلی احساسات و جذبات اور عشق و عاشقی کے معاملات پر زور دیا جاتا ہے۔ یہ سب نفسیاتی حوالے سے محرکات کی حیثیت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ غزل کے نفسیاتی مطالعے میں جنسیت کو اہم مقام حاصل ہے۔ فراق گورکھپوری ادبی تخلیق کے حوالے سے جنس کی اہمیت کے شدت سے قائل ہیں۔ وہ اپنی معروف تالیف اردو کی عشقیہ شاعری میں تحریر کرتے ہیں:

"تمام جاندار جذبۂ جنسیت کی تخلیق ہیں۔ شدت محبت، گرویدگی، فریفتگی خلاقانہ حالتیں ہیں۔"[٧]

ادب کو جنسیت کے نفسیاتی اور جذباتی پہلوؤں سے از حد دلچسپی ہے۔ سلیم احمد نے بھی اپنے ایک مقالہ "اردو غزل" میں غزل کا نفسیاتی اور جنسی مطالعہ کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا:

"غزل نے جنسی جذبے کی حیوانی خشونت اور سختی کو دور کر کے اس میں انسانی نرمی پیدا کی ہے۔ ...اردو غزل جنسی جذبے کو دوسری ضرورتوں پر ترجیح نہیں دیتی لیکن یہ بھی نہیں چاہتی کہ زندگی کی دوسری ضرورتیں جنسی جذبے پر غالب آ جائیں۔ اس لیے اس کا رویہ مفاہمت کا ہے۔"[٨]

یہ غزل کا وہ مقام ہے جہاں اس کی حیثیت ادب کی سطح پر اور بھی ممتاز ہو جاتی ہے کیوں کہ دوسری اصناف سخن کے برعکس غزل نے جنس کا کھلی بانہوں سے استقبال کیا۔ یقیناً غزل جنس کو موضوع بنانے سے انکاری نہیں ہے مگر غزل نے جنس کو تہذیب اور شائستگی کے دائرے میں لا کر مہذب بنا دیا ہے۔

غزل کا نفسیاتی مطالعہ اس وقت تک نامکمل دکھائی دیتا ہے جب تک غزل میں استعمال کیے جانے والے تشبیہات و استعارات کا ذکر نہ کیا جائے۔ تشبیہ علم بیان کی پہلی قسم ہے۔ دراصل تشبیہ سازی اس ذہنی عمل کا اظہار ہے جس میں الفاظ کا استعمال حقیقت کے بجائے مجازی معنوں میں ہوتا ہے۔ الفاظ حقیقی معنوں کی نسبت زیادہ پر اثر اور دلکش محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ شاعر اپنے لاشعوری محرکات سے کام لے کر تشبیہ و استعارہ کا استعمال کرتا ہے اور قاری بھی لاشعوری سطح پر پہنچ کر شاعر کے تلازمات سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس طرح جذبات سے لطف اندوزی کے مرحلے میں شاعر اور قاری ایک ہی جیسی سطح پر موجود ہوتے ہیں۔ ریاض احمد نے تشبیہ و استعارہ کے متعلق اظہار خیال کیا:

"مثلاً جب ہم محبوب کے رخسار کا تصور پیش کرتے ہیں اور اس کے لیے شعلہ گل کا استعارہ پیش کرتے ہیں۔اس استعارے سے رخسار کا وہ مخصوص رنگ اور نزاکت، جن میں اس کی کشش کا راز پنہاں ہے نہایت بلیغ پیرائے میں قاری کے ذہن میں پہنچ جاتے ہیں۔" ۹؎

تشبیہ و استعارہ یا مجاز کا استعمال نہ صرف قدیم شاعروں کی شاعری میں شامل رہا ہے بلکہ جدید شعرا نے اسے میراث سمجھتے ہوئے بہترین طریقے سے شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ محمد حسن عسکری نے استعارے کے نفسیاتی مطالعے کے دوران استعارے اور خواب کے عمل کو یکساں قرار دیا ہے۔انہوں نے اپنے مشہور مقالے "استعارے کا خوف" میں اس نکتے کو وضاحت سے پیش کیا کہ خواب کی پیدائش کا عمل اور استعارے کی پیدائش کا عمل ایک دوسرے سے جدا نہیں ہے۔ محمد حسن عسکری کے مطابق:

"آدمی اپنے تجربات کو قبول بھی کرتا جاتا ہے اور رد بھی، ان دورحجانات میں سمجھوتے سے صورت نکلتی ہے کہ تجربہ براہِ راست تو ظاہر نہیں ہوتا، ہو بھی نہیں سکتا۔اس کی بجائے کوئی خارجی چیز تجربے کی قائم مقام بن جاتی ہے۔اس عمل کے ذریعے چاہے خواب وجود میں آئے یا استعارہ،اس میں ہمارے شعور، ذاتی لاشعور، اجتماعی لاشعور، احساس، جذبے اور خیال کے ساتھ ساتھ ہمارے گردوپیش کا وہ حصہ بھی شامل ہے جو ہم نے اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔لہٰذا استعارے کی تخلیق کے لیے آدمی میں دو طرح کی ہمت ہونی چاہیے۔ایک تو اپنے لاشعور سے آنکھیں چار کرنے کی، دوسرا اپنی خودی کی کوٹھڑی سے نکل کر گردوپیش سے ربط قائم کرنے کی۔" ۱۰؎

محمد حسن عسکری نے جس انداز میں غزل کے ساتھ نفسیاتی عوامل کا ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے، وہ بڑی خاصے کی چیز ہے۔انہوں نے اپنے ایک اور مضمون میں بھی استعارے اور خواب کے عمل کو برابری کا درجہ عطا کیا ہے۔ محمد حسن عسکری کے مطابق استعارے کا تخلیقی عمل اور خواب کا تخیلی عمل یکساں حیثیت کے حامل ہیں۔ محمد حسن عسکری کے علاوہ مرزا محمد ہادی رسوا نے بھی تشبیہ و استعارہ کی نفسیاتی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔رسوا کے مطابق تشبیہ، استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ سب لذت کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔وہ اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ علم بیان اور صنائع بدائع سے لذت کیوں حاصل ہوتی ہے۔ ان کے مطابق تشبیہ سننے کے بعد سننے والے کو اپنی فکر کو استعمال کرنے کا موقع ملتا ہے اور یوں استعمال لذت کی وجہ بن جاتا ہے۔کیوں کہ اس صورت میں قوت فکر کا اثر دماغ کے ان حصوں تک پہنچتا ہے جو مدت سے بیکار پڑے ہوتے ہیں۔اسی طرح استعارہ بھی مسرت حاصل کرنے

کی وجہ بنتا ہے۔ مرزا رسوا کے مطابق استعارہ تشبیہ کے مقابلے میں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے۔ رسوا نے استعارے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد احسن نے لکھا ہے:

> ''مرزا رسوا نے استعارے کی تقسیم بھی نفسیاتی اثر کے لحاظ سے کی ہے۔ یعنی وہ استعارے جن کا مقصد محض توضیحی ہے یا جن سے وجدانی کیفیات پیدا ہوتی ہیں یا جن سے تعجب کا خوشگوار اثر مرتب ہوتا ہے اور اسی لئے جس طرح تشبیہات عام اور مروج ہو کر اپنا اثر کھو بیٹھتی ہیں اور ان سے استعجاب اور انبساط پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح استعارے بھی عام اور متبذل ہو کر پامال ہو جاتے ہیں اور ان میں وہ قوت باقی نہیں رہتی۔ ذہن اصل ماخذ کی طرف رجوع نہیں ہوتا جو استعارے کا مقصد ہوتا ہے۔''[١١]

ان مراسلات کے ذریعے مرزا رسوا نے اردو ادب کو نئے زاویے عطا کئے، اردو میں شعر و ادب کو علم النفس کے حوالے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ مگر رسوا کے مراسلات نے ادب کو پہلی بار علم نفسیات کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی اور ان کے یہ مقالات اردو ادب اور اردو تنقید میں نفسیاتی رجحانات لانے کے لیے محرک ثابت ہوئے۔

غزل کے نفسیاتی مطالعے کو عام طور پر نرگسیت کے پیمانے میں پرکھا جاتا ہے۔ علم نفسیات کی اصطلاحات میں سے ایک نرگسیت بھی ہے جس کا بنیادی مفہوم خود پسندی ہے۔ اس کے علاوہ نرگسیت اور خوش فہمی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ قدیم و جدید شعرا کی شاعری کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل میں نرگسیت کا عنصر ہر شاعر کے یہاں موجود ہے، چاہے کم یا زیادہ مقدار میں ہی کیوں نہ ہو۔ سید شبیہ الحسن نے اپنے مقالے "غزل میں نرگسیت" میں اس خیال کا اظہار کیا:

> "غزل میں نرگسیت ہر شاعر کے یہاں کسی نہ کسی مقدار میں ملتی ہے۔"[١٢]

اس کی مزید وضاحت سید شبیہ الحسن نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "غزل میں عام طور پر نرگسیت اس لازمی مقدار سے زیادہ موجود ہوتی ہے جو ہر انسان میں پائی جاتی ہے مگر یہ مقدار اتنی وافر نہیں ہوتی کہ اسے مرض قرار دیا جا سکے۔ اس لیے غزل کی نرگسیت آسانی سے محسوس کی جا سکتی ہے۔ مگر اتنی بری معلوم نہیں ہوتی۔... غزل میں نرگسیت دروں بینی کی راہ سے داخل ہوتی ہے اور پھر لہو کا ایک جزو بن کر پورے بدن میں دوڑ جاتی ہے۔"[١٣]

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو غزل میں موجود نرگسیت دراصل غزل کے حسن میں اضافے کی موجب ہے۔ نرگسیت کی مثال غزل کے مقطع کے ذریعے بھی پیش کی جاسکتی ہے کیوں کہ مقطع کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہے کہ شاعر اس میں اپنے تخلص کا استعمال کر کے اسے ذاتی بنا دیتا ہے۔ غزل کے باقی اشعار کم و بیش لوگوں کے لیے ہوتے ہیں مگر تخلص کی بنیاد پر شاعر اپنے لیے مقطع لکھتا ہے اس لیے جن شعرا کے ہاں عام طور پر نرگسیت کا نفسیاتی عنصر دکھائی نہ بھی دے تو ان کے مقطع نرگسیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مقطع میں تعلّی کا استعمال قدیم روایات کے مطابق کیا جاتا ہے اور جو مضامین بھی تعلّی کے زمرے میں آتے ہیں وہ تمام نرگسیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر تحریر کرتے ہیں:

> "تعلّی غزل کی اہم ترین روایات میں سے ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے دیکھیں تو تعلّی نرگسیت کا ادبی روپ قرار دی جاسکتی ہے کہ اس میں بھی شاعر معاصرین کے مقابلے میں اپنی برتری اور عظمت کا اظہار کرتا ہے۔"[۴]

نرگسیت سے نہ فرد بچا ہوا ہے نہ ہی فنکار۔ یہ نفسیاتی حوالہ تو انسان کو اپنے دل و دماغ، ظاہر و باطن پر ہی فریفتہ نہیں کرتا بلکہ اس سے اس کے اوصاف کا اقرار بہ زبان قلم کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے اس لیے تقریباً تمام اصناف میں فن کار نے محسوس اور غیر محسوس طریقے سے نرگسیت کا اظہار کیا ہے کیونکہ کوئی بھی ادیب اور شاعر انسان ہونے کے ناطے اپنی منفرد نفسیات کا حامل ہے۔ کوئی بھی فنکار انفرادی اور اجتماعی نفسیات کا اثر قبول کرتا ہے اور اپنی تحریروں کے ذریعے اظہار کرتا ہے۔ انسانی جذبات، حرکات و سکنات اور رویوں پر نفسیات نے جس جس طرح اثر ڈالا ہے اور انسانی ذہن کی جن جن پرتوں کو نفسیات نے کھولا ہے، ادب کے ذریعے ادیب نے اس کی عکاسی کی ہے اور اسے ادب کا حصہ بنایا ہے۔ المختصر نفسیات نہ صرف زندگی پر اثر انداز ہو رہی ہے بلکہ اس نے ادب پر بھی اثر انداز ہو کر موضوعات کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔

حوالہ جات:

۱۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، ارسطو سے ایلیٹ تک ، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۵ء، ص ا
۲۔ ایضاً، ص ۵۵
۳۔ محمد ہادی حسین، شاعری اور تخیل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء، ص ۳۷
۴۔ محمد نعیم بزمی، امیجری، لاہور: محبوب پبلشرز، ۲۰۰۵ء، ص ۴۹

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی،ارسطو سے ایلیٹ تک ،ص۳۱۵
۶۔ سید شبیہ الحسن،تنقید و تحلیل ،لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو،۱۹۵۸ء،ص۱۵۷
۷۔ فراق گورکھپوری،اردو کی عشقیہ شاعری،الہ آباد:سنگم پبلشنگ ہاؤس،۱۹۴۵ء،ص۳۰
۸۔ سلیم احمد،(مقالہ) اردو غزل،مشمولہ: ماہنامہ،ساقی،کراچی ۱۹۵۴ء
۹۔ ریاض احمد، تنقیدی مسائل،لاہور:اردو بک اسٹال، ۱۹۶۱ء،ص۲۶
۱۰۔ محمد حسن عسکری،مقالہ استعارے کا خوف،مشمولہ:ستارہ یا بادبان، مکتبہ سات رنگ،کراچی: ۱۹۶۳ء، ص۲۶
۱۱۔ سید شبیہ الحسن،تنقید و تحلیل،لکھنؤ: ادارہ فروغ اردو،۱۹۵۸ء،ص۸۵
۱۲۔ ڈاکٹر محمد حسین،مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات،علی گڑھ:ادارہ تصنیف، ۱۹۶۱ء،ص۲۳
۱۳۔ ایضاً،ص۸۵
۱۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر،نفسیاتی تنقید،ص۲۶۳